رضوان اللہ

البیان

خصائص و امتیازات

(۲)

الفاظ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

لفظ معنی کے اِبلاغ کا ایک موثر ذریعہ ہوتے ہیں۔ مخاطَب کی طرف سے دیکھا جائے تو یہ ابلاغ بہت کچھ اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ اُن کا مرادی معنی کیا صحیح طور پر متعین کر لیا گیا ہے یا نہیں؟ معمول میں یہ کام انتہائی درجے کی سادگی سے انجام پا جاتا ہے اور اس کے لیے کوئی مشقت اٹھانے کی بالکل ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ، بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس میں کچھ نزاکتیں در آتی ہیں[۴]، جن کا اگر لحاظ نہ رکھا جائے تو اس بات کا احتمال بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ ابلاغ کے عمل میں کوئی نقص یا اصل مدعا ہی سے قطعی انحراف واقع ہو جائے۔ قرآن بھی الفاظ سے تخلیق پانے

۴؎ جیسا کہ مثال کے طور پر لفظ کا اصل معنی زیادہ معروف نہ رہے اور ہم اس سے کوئی اور معنی مراد لے بیٹھیں۔ لفظ میں کوئی نیا معنی پیدا ہو جائے اور ہم اُسے ہی متکلم کا منشا قرار دے لیں۔ لفظ ایک سے زائد معانی کے لیے استعمال ہوتا ہو اور ہم یہ نہ جان سکیں کہ متکلم نے ان میں سے کون سے معنی کا ابلاغ کرنا چاہا ہے۔ یا لفظ ایک جامع مفہوم کا حامل ہو اور ہمیں معلوم نہ ہو سکے کہ سیاق و سباق میں آ کر اس میں کیا تخصیص پیدا ہو گئی ہے۔

والا ایک کلام ہے، چنانچہ ضروری ہے کہ اس کا ترجمہ کرتے ہوئے بھی اس طرح کی تمام باریکیوں کا خیال رکھا جائے اور اس کے الفاظ کا مرادی معنی معلوم کرنے میں بہت زیادہ اہتمام سے کام لیا جائے۔ ہم اس نظر سے جب ''البیان'' کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کچھ باتیں معنی کی تعیین کے اس کام میں اصل اصول کی حیثیت رکھتی ہیں اور کچھ باتیں وہ ہیں جو اطلاق کی حیثیت رکھتی ہیں، مگر وہ اِس کام کے طریق کو بالکل واضح کر دینے والی ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہم انھیں اصل اصول اور منہج وطریق کے دو الگ ناموں کے تحت بیان کر سکتے ہیں۔

اصل اصول

اصولی حیثیت کی یہ باتیں قرآن کے ہر ہر لفظ کے ترجمہ میں ملحوظ رکھی گئی ہیں اور یہ تعداد میں چند ایک ہیں، جیسا کہ معروف معنی، صحیح معنی اور قراءتِ عامہ۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

معروف معنی

قرآن واقعہ میں اور خود اپنی شہادت کے مطابق بھی عربی مبین میں نازل ہوا ہے[۵]۔ یہ حقیقت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اُس کے الفاظ کا ترجمہ اُن کے معروف معنی کے لحاظ سے کیا جائے اور اس عمل میں کسی شاذ مفہوم کو ہرگز راہ نہ دی جائے کہ ایسا کرنا اصل میں اس کلام کی فصاحت اور بلاغت کا انکار کر دینا ہے۔ چنانچہ ''البیان'' میں اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ ہر لفظ سے وہی معنی مراد لیا جائے جو اہل زبان کے ہاں معروف اور عام طور پر جانا پہچانا ہو۔ اس اصول کی مثال میں اس آیت کو دیکھ لیا جا سکتا ہے:

اَلشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ بِحُسۡبَانٍ. وَّ النَّجۡمُ وَ الشَّجَرُ یَسۡجُدٰنِ. (الرحمٰن ۵۵: ۵-۶)

''سورج اور چاند ایک حساب سے گردش میں ہیں، اور تارے اور درخت، سب سجدہ ریز ہیں۔''

'النَّجۡم' سے مراد ستارے ہیں۔ یہاں اس سے بعض مترجمین نے بے تنے کے پودے اور جھاڑ وغیرہ مراد لیے ہیں۔ خاص اس آیت میں معمول سے ہٹ کر معنی لینے کی وجہ یہ ہوئی کہ اُن کے نزدیک ایک تو سورج اور چاند جیسی آسمانی نشانیوں کے بعد اب زمین کی نشانیوں کا ذکر ہے، اس لیے یہاں 'النَّجۡم' سے مراد زمین ہی کی کوئی چیز ہونی

۵؎ الشعراء ۲۶: ۱۹۵۔

چاہیے۔ دوسرے یہ کہ اس کا 'الشَّجَر' کے ساتھ مذکور ہونا بھی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس سے مراد زمین پر پائے جانے والے پودے ہی مراد لیے جائیں اور مزید یہ کہ 'النَّجم' کا ایک مطلب لغت کی کتابوں میں بے تنے کے پودے پایا بھی جاتا ہے۔ اس کے مقابل میں جن حضرات نے اس کا ترجمہ ''ستارے'' کرنے پر اصرار کیا ہے، اُن کے نزدیک اس کی دلیل صرف یہ ہے کہ قرآن میں الگ سے ستاروں کے سجدہ ریز ہونے کا ذکر موجود ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ بعض علماے تفسیر کی بھی اس مقام پر یہی راے ہے۔ ''البیان'' میں بھی اس کا ترجمہ ''تارے'' کیا گیا ہے، مگر اس کی وجہ کچھ اور نہیں، بلکہ وہی اصول ہے جس کے مطابق ہر لفظ کا صرف معروف معنی مراد لیا جائے گا اور ہم جانتے ہیں کہ عربی زبان میں یہ معروف معنی ستاروں ہی کا ہے۔ باقی جہاں تک درختوں کے ساتھ ان کی مناسبت کا معاملہ ہے تو واضح رہے کہ اس طرح کی باتیں لفظ کی حقیقی مراد کو پا لینے کے بعد ہی زیر بحث آنی چاہییں اور ''البیان'' میں یہ اسی ترتیب سے زیر بحث آتی بھی ہیں۔

ذیل کی آیات بھی معروف معنی میں ترجمہ کرنے کی اچھی مثال ہیں اور ''البیان'' میں ان کا ترجمہ کرتے ہوئے 'اِبِل' سے اونٹ، 'بَیض' سے انڈے اور 'اِنحَر' سے مراد قربانی کی گئی ہے، نہ کہ بادل، انڈوں کی چھپی ہوئی جھلی اور سینے پر ہاتھ باندھنا جیسے شاذ مفاہیم:

اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ. (الغاشیہ ۸۸:۱۷)	''(یہ نہیں مانتے) تو کیا اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے ہیں؟''
کَاَنَّہُنَّ بَیۡضٌ مَّکۡنُوۡنٌ. (الصافات ۳۷:۴۹)	''گویا کہ (شترمرغ کے) چھپے ہوئے انڈے ہیں۔''
فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ. (الکوثر ۱۰۸:۲)	''اس لیے تم (اس بیت عتیق میں اب) اپنے پروردگار کی نماز پڑھنا اور اُسی کے لیے قربانی کرنا۔''

یہاں اس بات پر بھی توجہ رہے کہ کسی لفظ کا اہل زبان کے ہاں غیر معروف ہونا، ایک چیز ہے اور اس کا ہماری تفسیر کی کتابوں میں غیر معروف ہو کر رہ جانا، یہ بالکل دوسری چیز ہے۔ مثال کے طور پر:

وَالَّذِیۡۤ اَخۡرَجَ الۡمَرۡعٰی. فَجَعَلَہٗ غُثَآءً اَحۡوٰی. (الاعلیٰ ۸۷:۴-۵)	''جس نے سبزہ نکالا، پھر اُسے گھنا سرسبز و شاداب بنا دیا۔''

'غُثَآءً اَحۡوٰی' کا ترجمہ عام طور پر مترجمین ''سیاہ کوڑا'' کے الفاظ میں کرتے ہیں اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ مفسرین کے ہاں ایک تسلسل سے ان الفاظ کا یہی معنی بیان کیا گیا، حتیٰ کہ خیال ہونے لگا کہ یہ اِن الفاظ کا

معروف معنی ہے حالاں کہ 'غُثَآء' کی حد تک تو صحیح ہے کہ یہ گھنی گھاس کے لیے بھی آ جاتا ہے اور کوڑا کرکٹ اور خس و خاشاک کے لیے بھی، مگر 'اَحوٰی' کا لفظ ہرگز اُس سیاہی کے لیے نہیں آتا جو کسی شے کی بوسیدگی اور پامالی کی وجہ سے اس پر آ جاتی ہے، بلکہ یہ اُس سیاہی مائل سرخی اور سبزی کے لیے معروف ہے جو کسی شے پر اُس کی شادابی اور تازگی کے سبب سے نمایاں ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ 'اَحوٰی' کے معروف معنی کا خیال رہے اور موصوف اور صفت کی باہمی مناسبت کا بھی دھیان رہے تو 'غُثَآءً اَحوٰی' کا ترجمہ اب سیاہ کوڑا کرکٹ کرنے کے بجاے گھنا اور سرسبز و شاداب ہی کرنا چاہیے، جیسا کہ ''البیان'' میں کیا گیا ہے: ''پھر اُسے گھنا اور سرسبز و شاداب بنا دیا۔''

صحیح معنی

دوسری چیز جو ''البیان'' میں اصول کے طور پر ہر آیت کے ترجمے میں کارفرما نظر آتی ہے، وہ غلط معنی سے اجتناب اور صحیح معنی پر مترجم کا اصرار کرنا ہے[۶]۔ معنی کو صحیح قرار دینے کی ایک سے زائد بنیادیں ہو سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر، قرآن نے ہمیں بتایا ہے کہ اسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان میں اتارا گیا ہے[۷] اور ہم جانتے ہیں کہ آپ کی زبان وہی تھی جو اہل مکہ کے ہاں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ سو قرآن کے الفاظ کا صحیح مفہوم اب وہی ہو سکتا ہے جس سے اہل مکہ اور بالخصوص قریش کے لوگ واقف ہوں، نہ کہ وہ مفہوم جس کے لیے ہمیں کسی دوسرے مقام اور قبیلے کی زبان سے استدلال لانا پڑے۔ اور مزید یہ کہ وہ آپ کے زمانے میں سمجھا جانے والا مفہوم ہو، نہ کہ وہ بعد میں اس لفظ کے اندر کسی زمانے میں تولد ہوا ہو۔ اسی طرح مثال کے طور پر، ہمارے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ ہم قرآن کی اتباع کریں، چنانچہ اس لحاظ سے بھی اب صحیح مفہوم وہی ہو سکتا ہے جو قرآن کو موضوعی کے بجاے معروضی انداز میں دیکھنے کے نتیجے میں ہمارے سامنے آئے اور اس پر یہ بھی لازم ہوگا کہ اس عمل میں ہر طرح کی تحقیق اور گہرے غور و خوض کو بھی بروے کار لایا جائے کہ اس کے بغیر ممکن ہے کہ ہم کسی غلط معنی کو لفظ کی اصل مراد قرار دے بیٹھیں۔ چند آیتوں کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جن سے یہ اصول بالکل واضح ہو کر ہمارے سامنے آ جائے گا:

۱۔ اہل مکہ کی زبان ہی اس معاملے میں صحیح اور غلط کا معیار ہے، اس کے لیے ذیل کی آیت کا ترجمہ دیکھ لیا جا سکتا

۶؎ یہاں یہ فرق واضح رہے کہ معروف کے مقابلے میں شاذ معنی اپنی حقیقت میں غلط نہیں ہوتا، بلکہ وہ عام طور پر استعمال میں نہیں لایا جاتا، لیکن اس دوسرے اصول کے مطابق جو معنی صحیح کے مقابلے میں آتا ہے، وہ اصل میں سرے سے غلط ہوتا ہے۔

۷؎ الدخان ۴۴: ۵۸۔

ہے:

قَالَ اَحَدُھُمَآ اِنِّیۡۤ اَرٰنِیۡۤ اَعۡصِرُ خَمۡرًا. ''اُن میں سے ایک نے (ایک دن) اُس سے کہا:
(یوسف ۱۲: ۳۶) میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ شراب نچوڑ رہا ہوں۔''

سیدنا یوسف کے ساتھ قید دو آدمیوں نے آپ سے اپنے خوابوں کی تعبیر پوچھی۔ ایک نے کہا: میں خواب میں دیکھتا ہوں: 'اَعۡصِرُ خَمۡرًا' (میں خمر نچوڑ رہا ہوں)۔ یہ لفظ اہل مکہ کے ہاں شراب کے لیے عام استعمال ہوتا ہے اور قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی یہ اسی معنی میں آیا ہے، مگر بعض لوگوں کے ہاں جب یہ اُلجھن پیدا ہوئی کہ حقیقت میں تو شراب کے بجاے انگور نچوڑے جاتے ہیں تو اُنھوں نے اِس کا حل یہ نکالا کہ 'خَمۡر' کا ترجمہ یہ کہتے ہوئے انگور کر دیا کہ اسے عُمان میں رہنے والے لوگ اسی معنی میں بولا کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف، ''البیان'' میں اس اصول کی رعایت سے کہ ترجمہ ہمیشہ اہل مکہ کی زبان کو سامنے رکھتے ہوئے کیا جائے گا، اسے انھی لفظوں میں ادا کیا گیا ہے کہ ''شراب نچوڑ رہا ہوں۔'' باقی جہاں تک 'شراب' کے لفظ میں کسی الجھن کے پیدا ہونے کی بات ہے تو جان لینا چاہیے کہ اس معاملے میں زبان کے ایک معروف قاعدے سے صرف نظر ہو گیا ہے جسے 'تسمية الشيء بما يؤول إليه' کہا جاتا ہے، یعنی غایت اور نتیجے کے اعتبار سے کسی لفظ کا استعمال کرنا۔ انگور نچوڑنے کی غایت اگر شراب بنانا ہے تو اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں۔ یہ اسلوب ہماری زبان میں بھی موجود ہے، جیسا کہ مثال کے طور پر ہم کہیں: ''مزدور کنواں کھود رہے ہیں۔'' حالاں کہ وہ زمین کھود رہے ہوتے ہیں کہ جس کا مقصد کنواں بنانا ہوتا ہے۔ ''درزی دلہا کا سوٹ سی رہا ہے۔'' حالاں کہ وہ کپڑے کے پارچے سی رہا ہوتا ہے کہ جس کا مقصد سوٹ تیار کرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں: ''چکی آٹا پیس رہی ہے۔'' حالاں کہ وہ گندم پیس رہی ہوتی ہے کہ جس سے مقصود آٹا حاصل کرنا ہوتا ہے۔

۲۔ اس معاملے میں قریش کی زبان ہی اصل قرار پائے گی، اس کے لیے ''البیان'' میں کیا گیا اس آیت کا ترجمہ دیکھ لیا جا سکتا ہے:

وَنَادٰی نُوۡحُ ۨ ابۡنَهٗ. (ہود ۱۱: ۴۲) ''اور نوح نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔''

بعض حضرات نے ایک خود ساختہ اعتراض سے بچنے کی غرض سے یہاں 'ابۡنَهٗ' کا ترجمہ 'ابن امرأته' کیا ہے، یعنی نوح نے اپنی بیوی کے بیٹے کو آواز دی اور اس کی دلیل میں کہا ہے کہ قبیلہ طی ء کے لوگ 'ابۡنَهٗ' سے یہی معنی مراد لیتے ہیں، حالاں کہ ہم جانتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ قبیلہ طی ء سے تعلق رکھتے تھے اور نہ قرآن ہی اُس قبیلے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کی زبان میں اتارا گیا تھا۔

۳۔لفظ کے اُسی مفہوم کو ترجمہ میں لکھا جائے گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس سے سمجھا جاتا رہا ہو نہ کہ اُسے جو بعد میں کہیں جا کر اس کے اندر متولد ہوا ہو، اس کے لیے ذیل کی آیت کا ترجمہ غور طلب ہے:

وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ. (آل عمران ۳:۷) ''دراں حالیکہ ان کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

فرمایا ہے کہ قرآن میں محکمات اور متشابہات، دونوں طرح کی آیات ہیں۔ جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے، وہ متشابہات کے درپے ہوتے ہیں اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ فتنہ پیدا کریں اور اس کی حقیقت کو جان لیں، دراں حالیکہ اُن کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ قرآن کے زمانۂ نزول میں لفظ 'تَاْوِیْل' کا اصل معنی کسی چیز کی حقیقت کو جان لینا تھا اور اس پر قرآن کے دیگر کئی مقامات بھی شاہد ہیں، چنانچہ ''البیان'' میں اس کا ترجمہ یہی لکھا گیا ہے اور اُن آرا سے ہرگز کوئی اعتنا نہیں برتا گیا جو اس کا معنی ''مطلب''، ''مراد'' اور ''تفسیر'' کرتے ہیں کہ یہ اس لفظ کے سراسر متولد مفاہیم ہیں۔[۸]

۴۔اسی طرح یہ بھی ''صحیح معنی'' کے اصول پر اصرار ہی ہے کہ ''البیان'' میں موضوعی کے بجاے معروضی انداز اپنایا گیا ہے۔ سادہ لفظوں میں بیان کیا جائے تو موضوعی انداز اصل میں خارج کی بات کو قرآن میں داخل کر دینا ہے اور معروضی انداز سے مراد، قرآن کو اس کی اپنی صورت میں، جیسا کہ وہ ہے، دیکھنے کا التزام کرنا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے ایک مثال کافی ہو سکتی ہے:

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ. (آل عمران ۳:۵۵) ''اُس وقت جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھے وفات دوں گا اور اپنی طرف اُٹھا لوں گا۔''

۸۔ بعض اوقات مترجمین لفظ کا معنی تو صحیح لکھ دیتے ہیں، مگر اس سے مراد متولد مفاہیم ہی لیتے ہیں۔ جیسا کہ مثال کے طور پر ان آیتوں میں عالم، فقہ، امام اور روح کے الفاظ سے ایک مذہبی عالم، فقہ کا علم، امامت کا عقیدہ اور یونانی علم کا تصورِ روح مراد لے لینا: 'اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا' (فاطر ۳۵:۲۸)۔ 'فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ' (التوبہ ۹:۱۲۲)۔ 'يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ' (بنی اسرئیل ۱۷:۷۱)۔ 'قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّىْ' (بنی اسرائیل ۱۷:۸۵)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

خارج کے تناظر میں دیکھنے کے بجاے اگر 'توفی' کے لفظ پر براہ راست غور کیا جائے تو اس کا صحیح ترجمہ وہی بنتا ہے جو ''البیان'' میں اختیار کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان میں یہ لفظ اپنے مجازی معنی، یعنی وفات کے لیے اس قدر معروف ہو گیا ہے کہ اسے حقیقی معنی میں لینے کے لیے اب کسی قرینہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی بعینہٖ مثال ہماری زبان میں لفظِ انتقال کی ہے۔ اس کے متعلق بھی ہم جانتے ہیں کہ یہ اپنے حقیقی معنی، یعنی منتقل ہونے کے بجاے اب اپنے مجازی معنی، یعنی وفات پا جانے میں زیادہ معروف ہو گیا ہے۔

یہاں ایک اور مثال کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہو گا کہ ''البیان'' میں معروضی انداز پر اس قدر اصرار پایا جاتا ہے کہ لفظ تو لفظ، حرف کا ترجمہ کرتے ہوئے بھی اس پر کسی درجے میں کوئی سمجھوتا نہیں ہوتا۔ مثلاً ذیل کی آیت میں حرف 'لَا' کا ترجمہ:

لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ. (الحدید ۵۷: ۲۹)

''تاکہ یہ اہل کتاب نہ جانیں کہ اللہ کے فضل پر اُن کا کوئی اجارہ نہیں ہے اور یہ کہ اللہ کا فضل اُس کے اپنے ہی ہاتھ میں ہے۔''

عام طور پر مترجمین نے 'لِئَلَّا' کے 'لَا' کو زائد قرار دے کر اس کا ترجمہ نہیں کیا کہ اُن کی دانست میں یہاں اس کا ترجمہ کرنا ایک طرح کے ابہام اور الجھاؤ کو پیدا کر دینا ہے۔ ''البیان'' میں اس طرح کے ہر اندیشے سے قطع نظر، حرف 'لَا' کا ترجمہ ''نہیں'' کے لفظ میں کیا گیا ہے کہ یہی اس کا صحیح معنی ہے اور اسے زائد قرار دینا اصل میں نفی کو اثبات میں بدل دینا اور اس طرح غلط معنی کو اختیار کر لینا ہے۔ باقی جہاں تک کسی اِبہام کا تعلق ہے تو ''نہیں'' کے اس ترجمے کے بعد بھی یہاں اصل بات بالکل واضح ہے۔ یہ اہل کتاب سے بے زاری کا جملہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ لوگ اسی بات کے سزاوار ہیں کہ حقیقت حال سے کبھی واقف نہ ہوں اور یونہی اپنے آپ کو اللہ کے انعامات کا تنہا حق دار سمجھتے رہیں اور نتیجے کے طور پر اُس کے انعامات سے یک سر محروم ہو کر رہ جائیں۔

۵۔ اس سارے عمل میں عمیق غور و فکر اور ہر طرح کی تحقیق کو بروے کار لانا بھی لازم ہے، اس کے لیے ذیل کی آیت کے ترجمہ میں اچھی دلیل موجود ہے:

اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا. (التحریم ۶۶: ۴)

''اگر تم دونوں اللہ کی طرف رجوع کرو تو یہی تمھارے لیے زیبا ہے، تمھارے دل تو اِس کے لیے مائل ہی ہیں۔''

یہاں 'صغو' کا لفظ آیا ہے، جس کا معنی ہے: مائل ہونا اور جھک جانا۔ عام طور پر مترجمین نے اس میلان سے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حق بات سے دور ہو جانا مراد لیا ہے۔ اُن کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے نبی کی بیبیو، اگر تم توبہ کرو تو تمھیں یہی کرنا چاہیے، اس لیے کہ تمھارے دل تک کج ہو چکے ہیں۔ اس کے برخلاف، ''البیان'' میں اس 'صغو' کا ترجمہ تو مائل ہونا ہی کیا گیا ہے، مگر اس میں پائے جانے والے باریک فرق کا لحاظ رکھتے ہوئے اس سے کسی شے سے انحراف کرنا نہیں، بلکہ اُس کی طرف جھکنا اور مائل ہو جانا مراد لیا گیا ہے، اس لیے کہ عربی زبان میں یہ اسی معنی میں آتا ہے[9]۔

قراءت عامہ

قرآن کے زمانۂ نزول میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیا گیا تھا کہ اس وقت جو قراءت کی جا رہی ہے، جمع و تدوین ہو جانے کے بعد اس کی جگہ ایک اور قراءت جسے ''عرضۂ اخیرہ'' کی قراءت کہتے ہیں، دی جائے گی۔ اور یہ بھی فرما دیا گیا کہ آپ کو بہرصورت اُسی کی پیروی کرنی ہے[10]۔ اور ہم جانتے ہیں کہ یہی قراءت ہے جسے بعد میں ''قراءت عامہ'' کہا گیا اور جسے امت کا اجماع اور قولی تواتر بھی حاصل ہوا۔ ''البیان'' میں قرآن کے اس حکم کی وجہ سے یہ بھرپور التزام کیا گیا ہے کہ ہر لفظ کا ترجمہ قراءت عامہ ہی کی روشنی میں کیا جائے، جیسا کہ مثال کے طور پر یہ آیت:

وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ. (الاعراف ۷: ۴۰)

''اور وہ ہرگز جنت میں داخل نہیں ہوں گے، جب تک اونٹ سوئی کے ناکے سے نہ گزر جائے۔''

حق کے مقابلے میں استکبار کرنے والوں کے متعلق بیان ہوا ہے کہ وہ ہرگز جنت میں داخل نہ ہو سکیں گے۔ اس کے بعد فرمایا ہے: 'حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ' (یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے سے نہ گزر جائے)۔ عربی زبان میں 'الجَمَل' سے اونٹ مراد لیا جاتا ہے، مگر بعض حضرات جب سوئی کے ناکے اور اونٹ کے درمیان میں پائی جانے والی مناسبت کو سمجھ لینے سے قاصر رہے تو اُنھوں نے اسے 'الجُمَّل' پڑھا اور اس سے ''موٹا رسا'' مراد لے لیا۔ ''البیان'' میں اس کا ترجمہ بہرصورت اونٹ ہی کیا جانا تھا کہ یہاں مترجم کے نزدیک قراءت عامہ ہی اصل قرآن ہے اور اس کو بدلنا گویا قرآن کو بدل دینا ہے۔ رہا سوئی کے ناکے کے ساتھ اس کی مناسبت کا سوال تو اصل میں تعلیق بالمحال کے اسلوب کا تقاضا ہے کہ سوئی کے ناکے جیسی چھوٹی چیز کے مقابلے میں یہاں ایک بڑی چیز کا بیان

---

[9] صحیح معنی تک اس رسائی سے یہ بات بھی بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ازواج مطہرات کی تنقیص کے بجاے اُن کے لیے خدا کی طرف سے اتارا گیا ایک تحسین کا جملہ ہے۔

[10] القیامہ ۷۵: ۱۷-۱۸۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کیا جائے جو کسی بھی صورت اس میں سے نہ گزر سکے۔ اب عربوں کی معاشرت اور اُن کے مزاج کی رعایت رہے تو اتنی بڑی اور گزر جانے والی یہ چیز آخر اونٹ کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے[11]؟

ذیل کی آیت بھی قراءت عامہ کے مطابق ترجمہ کرنے کی ایک اچھی مثال ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ. (آل عمران ۳: ۱۶۴)

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے تو مسلمانوں پر بڑا احسان فرمایا ہے کہ اُن کے اندر خود اُنھی میں سے ایک رسول اٹھایا ہے۔''

یہاں 'مِنْ اَنْفُسِهِمْ' کا لفظ آیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ''خود اُنھی میں سے''، یعنی مسلمانوں میں سے ہیں۔ بعض حضرات نے ایک اعتراض سے بچنے کے لیے جو حقیقت میں کوئی اعتراض نہیں ہے، اسے 'اَنْفَسِهِمْ' پڑھا ہے، یعنی وہ اُن کے شریف اور عمدہ لوگوں میں سے ہیں۔ ''البیان'' کے اصول کا تقاضا ہے کہ اس لفظ کا ترجمہ بہر حال قراءت عامہ کے مطابق کیا جائے اور وہ یہی بنتا ہے کہ رسول اللہ ''خود اُنھی میں سے'' ہیں۔ اس ترجمہ کے بعد اب اس کا مطلب بھی آسانی سے سمجھ لیا جا سکتا ہے۔ یہاں مسلمانوں پر جس احسان کا ذکر ہو رہا ہے، وہ اصل میں اپنی کامل صورت میں اُسی وقت سامنے آتا ہے جب یہ کہا جائے کہ اللہ کے رسول اُن کے لیے کوئی اجنبی آدمی نہیں ہیں کہ اسلام کی دعوت میں کسی ابہام کے رہ جانے اور اس طرح اُن کے نامراد ہو جانے کا کوئی امکان ہو، بلکہ وہ اُنھی میں سے ہیں، یعنی ملائکہ اور جنوں میں سے ہونے کے بجاے اُنھی کی طرح کے ایک انسان ہیں، انھی کی معاشرت میں جینے والے اور مزید یہ کہ اُنھی کی زبان میں اُن سے کلام کرنے والے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

منہج وطریق

بعض باتیں اصولی حیثیت نہیں رکھتیں اور ہر مقام پر الگ سے اپنائی گئی ہیں، مگر اس لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں کہ وہ معنی کی تعیین کے طریقۂ کار کو بالکل واضح کر دینے والی ہیں، جیسا کہ لفظ کی ساخت، لفظ کے عوارض، دیگر الفاظ، سیاق وسباق اور عرف ونظائر۔

---

[11] اہل عرب کا یہی مزاج تھا کہ ایک سریہ میں بہت بڑی مچھلی صحابۂ کرام کے ہاتھ لگی۔ اُن کے امیر ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس کی پسلی کی ہڈی کو کھڑا کیا اور ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ اونٹ پر سوار ہو کر اس کے نیچے سے گزرے (بخاری، رقم ۴۳۶۱)۔

لفظ کی ساخت

عربی زبان میں لفظ کی کنسٹرکشن معنی و مفہوم پر اچھا خاصا اثر رکھتی ہے۔ تراجم میں بالعموم اس کی رعایت کی جاتی ہے، مگر اس سے بعض معانی ایسے بھی پیدا ہوتے ہیں جو بسا اوقات نظر انداز ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس بات کی وضاحت ایک سے زائد عنوانات کے تحت کی جا سکتی ہے، مثلاً:

۱۔ مصدر اور اُس کے مشتقات

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ. بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ. (الصافات ۳۷: ۴۵-۴۶)

''اُن کے لیے شراب ناب کے جام گردش میں ہوں گے۔ بالکل صاف شفاف، پینے والوں کے لیے لذت ہی لذت۔''

یہ اہل جنت کو دی جانے والی نعمتوں کا بیان ہے کہ اُنھیں شراب خالص کے جام دیے جا رہے ہوں گے۔ وہ دیکھنے میں صاف شفاف اور پینے والوں کے لیے 'لَذَّة' ہوں گے۔ یہاں 'لَذَّة' اصل میں مصدر ہے اور صفت کے مفہوم میں آیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ جب مصدر صفت کے مفہوم میں استعمال ہو تو اُس میں ایک طرح کا مبالغہ پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ''البیان'' میں اس لفظ کا ترجمہ صرف ''لذت'' یا ''لذیذ'' کرنے کے بجاے ''لذت ہی لذت'' کیا گیا ہے۔

قرآن میں اس کی اور بھی کئی مثالیں موجود ہیں، جیسا کہ یہ آیت:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ. (الزخرف ۴۳: ۲۶)

''یاد کریں جب ابراہیم نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا تھا کہ جنھیں تم پوجتے ہو، میں اُن سے بالکل بری ہوں۔''

یہاں بھی مصدر 'بَرَآء' صفت کے مفہوم میں آیا ہے اور ''البیان'' میں اس سے پیدا ہو جانے والے مبالغے کو ''بری ہوں'' کے ساتھ ''بالکل'' کا لفظ لا کر ادا کیا گیا ہے۔

بعض اوقات مصدر ترجمے میں تاکید کا معنی بھی پیدا کر دیتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں:

كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ وَعْدًا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ. (الانبیاء ۲۱: ۱۰۴)

''ہم نے جس طرح پہلی خلقت کی ابتدا کی تھی، اُسی طرح ہم اُس کا اعادہ کریں گے۔ یہ ہمارے ذمے ایک حتمی وعدہ ہے، ہم اس کو ضرور کر کے رہیں گے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے عام طور پر مترجمین سے 'وَعْدًا' کا مصدر موکّد ہونا نظر انداز ہو گیا ہے۔ ''البیان'' میں اس کی پوری رعایت کی گئی ہے اور ترجمے میں اس کے لیے ''حتمی'' کا لفظ لایا گیا ہے۔

ترجمے میں مصدر کی طرح اس کے مشتقات کا معاملہ بھی بڑا غور طلب ہوتا ہے۔ جیسا کہ مثال کے طور پر اسم فاعل کا:

اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ. (المومن ۴۰: ۵۹)

''یہ بالکل قطعی ہے کہ قیامت آ کے رہے گی، اِس میں کوئی شک نہیں، مگر اکثر لوگ مان نہیں رہے ہیں۔''

یہاں قیامت کے بارے میں فرمایا ہے: 'لَاٰتِيَةٌ'۔ یہ اسم فاعل ہے اور ہم جانتے ہیں کہ قدیم عربی زبان میں فاعل کا وزن فعل میں زور لانے اور قطعیت کو ظاہر کرنے کے لیے بھی لایا جاتا ہے۔ بالعموم اردو کے مترجمین اس سے زیادہ واقف نہیں ہیں، مگر ''البیان'' کے مذکورہ ترجمے میں اسے بیان کرنے کی اچھی کوشش کی گئی ہے۔

یہ فاعل جس طرح اللہ کی طرف سے کیے گئے وعدے کی قطعیت کے لیے آیا ہے، اسی طرح بعض اوقات یہ اُس کے عزم جازم اور حتمی فیصلے کے لیے بھی آ جاتا ہے۔ اس کے لیے ذیل کی آیتوں کو دیکھ لیا جا سکتا ہے جن میں 'لَجٰعِلُوْنَ' اور 'فٰعِلِيْنَ' کے الفاظ میں پائے جانے والے اس مفہوم کو اردو میں مختلف طریقوں سے ادا کیا گیا ہے:

وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا. (الکہف ۱۸: ۸)

''ہم اُن سب چیزوں کو جو زمین پر ہیں (ایک دن بالکل نابود کر کے اُس کو) ایک چٹیل میدان بنا دینے والے ہیں۔''

كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ وَعْدًا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ. (الانبیاء ۲۱: ۱۰۴)

''ہم نے جس طرح پہلی خلقت کی ابتدا کی تھی، اُسی طرح ہم اُس کا اعادہ کریں گے۔ یہ ہمارے ذمے ایک حتمی وعدہ ہے، ہم اس کو ضرور کر کے رہیں گے۔''

ذیل کی آیت میں 'كُنَّا مُرْسِلِيْنَ' بھی فاعل کے وزن سے بنا ہوا 'كُنَّا فٰعِلِيْنَ' کی طرح کا اسلوب ہے جو خدا کے حتمی فیصلہ کو بیان کرنے کے لیے لایا گیا ہے:

وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ. (القصص ۲۸: ۴۵)

''تم مدین والوں کے درمیان بھی موجود نہ تھے، اُن کو ہماری آیتیں سناتے ہوئے، لیکن ہم فیصلہ کر چکے تھے کہ تمھیں رسول بنائیں۔''

فاعل کی طرح مفعول کے وزن کا بھی یہی معاملہ ہے، یہ بھی اپنے اندر ایک طرح کی تاکید اور قطعیت رکھتا ہے۔ دیگر ترجموں کے برعکس، ''البیان'' میں اس کی بھی پوری پوری رعایت رکھی گئی ہے، جیسا کہ ذیل کی آیت میں 'مَفْعُوْلًا'

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کا ترجمہ محض ہو جانے والی بات نہیں کیا، بلکہ اس میں پائی جانے والی حد درجہ قطعیت کو بھی بیان کیا ہے:

وَ کَانَ اَمۡرُ اللّٰہِ مَفۡعُوۡلًا. (النساء ۴: ۴۷) ''اور (یاد رکھو کہ) خدا کی بات ہو کر رہتی ہے۔''

اسم تفضیل عام طور پر دوسروں کے مقابلے میں مصدری معنی کی زیادتی کو بیان کرنے کے لیے آتا ہے، لیکن یہ بعض اوقات ہر طرح کے تقابل سے مجرد ہو کر بھی آ جایا کرتا ہے:

وَ مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَهُوَ یُخۡلِفُهٗ وَ هُوَ خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡنَ. (سبا ۳۴: ۳۹) ''اُس کی راہ میں جو چیز بھی تم خرچ کرو گے، وہ اُس کا صلہ دے گا اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔''

دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ 'خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡنَ' کا ترجمہ ''سب سے بہتر رزق دینے والا'' کرنے کے بجائے ''بہترین رزق دینے والا'' کیا گیا ہے، اور اس کی وجہ یہی ہے کہ یہاں اسم تفضیل، یعنی 'خَیۡر' کا لفظ کسی طرح کی ترجیح کے مفہوم میں نہیں، بلکہ محض بیان صفت کے لیے آ گیا ہے۔

اسم صفت بھی بعض مقامات پر کچھ خاص معنی ادا کرتا ہے:

ثُمَّ تَوَلَّیۡتُمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ. (البقرہ ۲: ۸۳) ''پھر تم میں سے تھوڑے لوگوں کے سوا تم سب (اُس سے) پھر گئے اور حقیقت یہ ہے کہ تم پھر جانے والے لوگ ہی ہو۔''

یہاں فعل 'تَوَلَّیۡتُمۡ' کے بعد 'مُّعۡرِضُوۡنَ' کی صفت آئی ہے۔ فعل کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ یہ اپنے اندر ایک طرح کا حدوث رکھتا ہے، مگر اس کے مقابلے میں صفت کے اندر کسی چیز کے مستقل وصف اور خصلت ہونے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ''البیان'' میں 'تَوَلَّیۡتُمۡ' کا ترجمہ ''پھر گئے'' کیا گیا ہے جو محض وقوع پذیر ہونے والے ایک فعل کا بیان ہے، مگر 'مُّعۡرِضُوۡنَ' کا ترجمہ ''تم پھر جانے والے لوگ ہی ہو'' کیا گیا ہے جو اُن لوگوں کے کردار کے ایک مستقل پہلو کو بیان کر رہا ہے۔

۲۔ صیغوں کا اختلاف

صیغوں کے بدل جانے سے بھی لفظ کے معنی بدل جاتے ہیں۔ عام طور پر تثنیہ کا صیغہ دو اور جمع کا صیغہ تین اور اس سے زائد افراد کے لیے لایا جاتا ہے، مگر ہم جانتے ہیں کہ بعض اوقات ان صیغوں سے کچھ اور معانی کا اِبلاغ بھی پیش نظر ہوتا ہے:

رَبُّ الۡمَشۡرِقَیۡنِ وَ رَبُّ الۡمَغۡرِبَیۡنِ. ''وہی مشرق کا رب ہے، اُس کے دونوں کناروں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

(الرحمٰن ۵۵: ۱۷) تک، اور وہی مغرب کا رب ہے، اُس کے دونوں کناروں تک۔''

اس آیت میں 'اَلْمَشْرِقَیْن' اور 'اَلْمَغْرِبَیْن' تثنیہ کی صورت میں آئے ہیں۔ مترجمین نے ان کا ترجمہ 'دو مشرق' اور 'دو مغرب' کے الفاظ میں کیا ہے اور اس سے بالعموم گرمی اور سردی کے مشرق مراد لیے ہیں۔ دراں حالیکہ عربی زبان میں تثنیہ کسی چیز کے دونوں کناروں کو بیان کرنے کے لیے بھی آتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ''البیان'' میں اس کا ترجمہ کرتے ہوئے ''اُس کے دونوں کناروں تک'' کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

ذیل کی آیت بھی اس کی ایک اچھی مثال ہے جس میں 'صَدَفَیْن' کے تثنیہ سے اصل میں پہاڑوں کے درمیان خلا کے دونوں کناروں کو بیان کرنا مقصود ہے:

حَتّٰٓی اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ قَالَ انْفُخُوْا. ''یہاں تک کہ جب اُس نے دونوں پہاڑوں کے درمیان خلا کو پاٹ دیا تو کہا کہ دھونکو۔'' (الکہف ۱۸: ۹۶)

جمع کا صیغہ بھی بعض اوقات جمع کے بجاے وسعتِ اطراف کو بیان کرنے کے لیے آ جاتا ہے:

فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ. ''سو نہیں، میں قسم کھاتا ہوں اُس کی جو مشرق و مغرب کی تمام وسعتوں کا مالک ہے۔'' (المعارج ۷۰: ۴۰)

اس آیت میں 'اَلْمَشٰرِق' اور 'اَلْمَغٰرِب' جمع کے صیغے ہیں۔ ان کا ترجمہ اکثر مترجمین نے ''مشرقوں'' اور ''مغربوں'' کے الفاظ میں کیا ہے اور اس سے سورج کے مختلف مطالع اور مغارب کو مراد لیا ہے۔ ''البیان'' میں جمع کے اس خاص پہلو کا لحاظ کرتے ہوئے کہ یہ بعض اوقات کسی شے کے اطراف کی وسعت کو بیان کرنے کے لیے بھی آتا ہے، اس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے: ''جو مشرق و مغرب کی تمام وسعتوں کا مالک ہے۔''

قرآن میں جمع کا صیغہ اس کے علاوہ بھی کئی مفاہیم کے پیش نظر استعمال کیا جاتا ہے:

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ. ''سو ان پر افسوس کر کر کے تم اپنے کو ہلکان نہ کرو۔'' (فاطر ۳۵: ۸)

یہاں 'حَسَرٰت' کے لفظ کی جمع اصل میں اُن لوگوں پر کیے جانے والے غم اور افسوس کی شدت کو بیان کرنے کے لیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''البیان'' میں اس کا ترجمہ کرتے ہوئے ''افسوس کر کر کے'' کے الفاظ لائے گئے ہیں اور ان میں ''کر'' کی تکرار درحقیقت افسوس کی اسی شدت کو ظاہر کرنے کی ایک کوشش ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بعض اوقات جمع کا صیغہ کسی شے کے وجود کو بیان کرنے کے لیے بھی آ جایا کرتا ہے:

فَاِنۡ کَانَ لَہٗۤ اِخۡوَۃٌ فَلِاُمِّہِ السُّدُسُ مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِیَّۃٍ یُّوۡصِیۡ بِہَاۤ اَوۡ دَیۡنٍ. (النساء ۴: ۱۱)

''لیکن اُس کے بھائی بہن ہوں تو ماں کے لیے وہی چھٹا حصہ ہے (اور باپ کے لیے بھی وہی چھٹا حصہ)۔ یہ حصے اُس وقت دیے جائیں، جب وصیت جو اُس نے کی ہو، وہ پوری کر دی جائے اور قرض، (اگر ہو تو) ادا کر دیا جائے۔''

اس آیت میں 'اِخۡوَۃ' جمع کا صیغہ ہے، چنانچہ مترجمین نے اس کا ترجمہ کرتے ہوئے ''کئی بھائی'' یا ''ایک سے زیادہ بھائی یا بہن'' وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ''البیان'' میں اس کے لیے محض ''بھائی بہن'' کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں 'اِخۡوَۃ' جمع کی صورت میں ہونے کے باوجود بیان عدد یا بیان نوع کے لیے نہیں، بلکہ محض بیان وجود کے لیے آیا ہے۔ جمع کا یہ استعمال ہماری زبان میں بھی پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم کسی دوست کو گاڑی میں جاتے دیکھیں اور وقت ملاقات اُس سے کہیں: ''بڑے مزے ہو رہے ہیں، جناب گاڑیوں میں پھرتے ہیں۔'' یہاں 'گاڑیوں' کا لفظ جمع کی صورت میں آیا ہے، مگر اس سے ہماری مراد نہ گاڑیوں کی تعداد بتانا ہے اور نہ اُن کی کسی مخصوص قسم کا تذکرہ کرنا۔

ماضی اور مضارع کے صیغے بھی عمومی معنی کے ساتھ ساتھ کچھ مزید معانی کا اِبلاغ کرتے ہیں:

اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ. (الکوثر ۱۰۸: ۱)

''ہم نے یہ خیر کثیر تمھیں عطا کر دیا ہے، (اے پیغمبر)۔''

یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو 'الۡکَوۡثَر' دیے جانے کی خوش خبری سنائی جا رہی ہے، مگر اس کے لیے ماضی کا صیغہ لایا گیا ہے۔ گویا یہ مستقبل میں ہونے والا واقعہ خدا کے ہاں اس قدر حتمی ہے کہ سمجھ لیا جائے کہ یہ ابھی سے واقع میں آ چکا۔ ''البیان'' میں دیگر مترجمین کی طرح 'اَعۡطَیۡنَا' کا ترجمہ فعل ماضی میں کیا گیا ہے، مگر اس کے بعد والے جملوں میں ''تم اپنے پروردگار کی نماز پڑھو اور اُسی کے لیے قربانی کرو'' کہنے کے بجاے ''تم اپنے پروردگار کی نماز پڑھنا'' اور ''اُسی کی قربانی کرنا'' کے الفاظ لائے گئے ہیں اور اسلوب کی اس تبدیلی سے پیش نظر یہی ہے کہ 'اَعۡطَیۡنَا' کا فعل ماضی وعدے کی قطعیت کو تو ضرور بیان کرے، مگر اگلے جملوں میں ''کرنا'' یہ بھی بتا دے کہ بہر کیف یہ مستقبل میں پوری ہونے والی ایک بشارت ہی ہے۔

وَ نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ ذٰلِکَ یَوۡمُ الۡوَعِیۡدِ.

''اور (وہ دیکھو) صور پھونکا گیا۔ یہ وہی دن ہے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

(ق ۵۰: ۲۰)　　جس کی وعید ہم نے تمھیں سنائی تھی۔''

یہاں بھی قیامت کے احوال کا ماضی کے صیغے میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے مقصود ایک بات تو وہی ہے کہ خدا کے وعدوں کی قطعیت کو بیان کیا جائے، مگر اس سے مقصود دوسری بات یہ ہے کہ اُن احوال کو قاری کی آنکھوں کے سامنے مصور بھی کر دیا جائے۔ ''البیان'' میں 'نُفِخَ' کا ترجمہ کرتے ہوئے اس دوسری بات کی بھی رعایت کی گئی ہے اور اس غرض سے ''وہ دیکھو'' کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

ماضی کی طرح مضارع بھی بعض اوقات کچھ خاص معنی ادا کرتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں یہ استمرار کا بیان کر رہا ہے:

وَاٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ. (البقرہ ۲: ۲۵۱)

''اور اللہ نے اُسے بادشاہی دی اور حکمت عطا فرمائی اور اُسے اُس علم میں سکھایا جو اللہ چاہتا ہے (کہ اپنے اس طرح کے بندوں کو سکھائے)۔''

یہاں 'عَلَّمَهٗ' کے فعل ماضی کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ 'مِمَّا شَآءَ' ہوتا، مگر دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ اس کے بجاے مضارع، یعنی 'مِمَّا يَشَآءُ' لایا گیا ہے۔ دراصل، اللہ نے نہیں چاہا کہ علم کی اس نعمت کا بیان حضرت داؤد سے مخصوص ہو کر رہ جائے، بلکہ اُس نے چاہا ہے کہ وہ اسے اپنی ایک مستقل سنت کی حیثیت سے بیان کرے۔ چنانچہ ''البیان'' میں 'مِمَّا يَشَآءُ' کا ترجمہ مضارع میں کرنے کے بعد اس سے پیدا ہونے والے استمرار کے مفہوم کو بھی قوسین میں کھول دیا گیا ہے۔

۳۔ ابواب کی خاصیات

عربی زبان میں لفظ مختلف ابواب میں کنسٹرکٹ ہوتا ہے۔ اس سے بھی اس کے معنی میں بعض خاصیات پیدا ہو جاتی ہیں اور ترجمہ کرتے ہوئے ضروری ہوتا ہے کہ ان کا خصوصی طور پر لحاظ رکھا جائے:

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ. (البقرہ ۲: ۹)

''وہ اللہ اور اہل ایمان، دونوں کو فریب دینا چاہتے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اپنے آپ ہی کو فریب دے رہے ہیں۔''

اس آیت میں 'يُخٰدِعُوْنَ' اور 'يَخْدَعُوْنَ' کے دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مترجمین نے عام طور پر ان دونوں کا ترجمہ ایک جیسا کیا ہے، یعنی دھوکا اور فریب دینا، حالاں کہ ہم جانتے ہیں کہ ایک ہی مقام پر دو مختلف ابواب سے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

فعل آ جائیں تو ان کا ایک جیسا ترجمہ کر دینا کچھ زیادہ موزوں نہیں۔ ''البیان'' میں 'خدع' اور 'مخادعة' کا ترجمہ مختلف طریقے سے کیا گیا ہے، یعنی 'خدع' سے مراد فریب دینا اور 'مخادعة' سے مراد فریب دینے کی کوشش کرنا۔[۱۲] اور دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ اس ترجمے سے وہ ساری بحثیں آپ سے آپ ختم ہو گئی ہیں جو تفسیر کی کتابوں میں اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں۔

فَلَمَّا رَاَیْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ. (الیوسف ۱۲: ۳۱)

''پھر جب عورتوں نے اُس کو دیکھا تو اُس کی عظمت سے مبہوت ہو گئیں اور (اپنی بات اُس سے منوانے کے لیے) اپنے ہاتھ جگہ جگہ سے زخمی کر لیے۔''

اصل میں 'قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اس کا ترجمہ کیا گیا ہے کہ اُنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور اس سے مراد یہ لی گئی ہے کہ وہ عورتیں سیدنا یوسف کے کردار کی عظمت کو دیکھ کر اس قدر مبہوت ہوئیں کہ اپنے ہاتھوں کو کاٹ بیٹھیں، دراں حالیکہ یہاں 'قَطَّعْنَ' اصل میں 'قطع' سے تفعیل ہے جس میں تکثیر کا پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ ''البیان'' میں تفعیل کی رعایت سے یوں ترجمہ کیا گیا ہے: ''اپنے ہاتھ جگہ جگہ سے زخمی کر لیے۔''[۱۳] اور اس سے مترجم کی مراد یہ ہے کہ ہاتھوں کا کٹنا بے خودی کی کیفیت میں ہو جانے والا کوئی واقعہ نہیں تھا، بلکہ یہ مصر کی بیگمات کی طرف سے کیا جانے والا ایک شعوری اِقدام تھا کہ وہ اپنے اس جذباتی مظاہرے سے سیدنا یوسف کو کسی طرح سے رام کر سکیں۔

وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْۤ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ. (النساء ۴: ۲۳)

''اور تمھاری وہ مائیں بھی جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا اور رضاعت کے اس تعلق سے تمھاری بہنیں بھی۔''

نکاح کے لیے حرام رشتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ تمھاری وہ مائیں بھی تم پر حرام ہیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا۔ اس کے لیے 'اَرْضَعْنَكُمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ باب اِفعال سے ہے جس کی خاصیات میں مبالغہ کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ ''البیان'' کے ترجمے میں مبالغے کے اس بیان کے لیے اردو کے اس جملے کو کافی سمجھا گیا ہے کہ ''تمھاری وہ مائیں بھی جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا''۔ البتہ، تشریحی نوٹ میں اس امر کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ رضاعت کسی کو اتفاقاً دودھ پلا دینے سے قائم نہیں ہو جاتی، بلکہ ضروری ہے کہ یہ نہایت اہتمام کے ساتھ اور ایک

۱۲؎ یہ 'مخادعة' باب مفاعلہ سے ہے اور مبالغہ کے لیے آیا ہے اور موقع کلام بتا رہا ہے کہ یہ مبالغہ اصل میں فریب دینے کی کوششوں میں کیا جا رہا ہے۔

۱۳؎ یہاں تکثیر کے پہلو کو ترجیح کیوں دی گئی ہے، اس کی وضاحت کے لیے ''البیان'' کے حواشی کی مراجعت کر لی جا سکتی ہے۔

مقصد کی حیثیت سے عمل میں آئے۔

لفظ کے عوارض

لفظ کی ساخت کے ساتھ دوسری اہم چیز اس پر آنے والے عوارض ہیں۔ یہ معنی و مفہوم پر اچھا خاصا اثر انداز ہوتے اور معنی کی تعیین کے اس کام میں بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ہم ان میں سے صرف چند ایک کا یہاں ذکر کرتے ہیں:

۱۔ الف لام کا آنا

عربی زبان میں اسم پر الف لام بھی آتا ہے جس کا ایک مقصد کسی چیز کو نکرہ کی حیثیت سے نکال کر اسے معرفہ بنا دینا ہوتا ہے۔ تراجم میں عام طور پر اس کی رعایت کی جاتی ہے، مگر اسے بعض مقامات پر سمجھنا اس قدر دقیق ہوتا ہے کہ یہ سرے سے نظر انداز ہو جاتا ہے۔ یا کسی مقام پر یوں ہوتا ہے کہ یہ عہد کے لیے لایا گیا ہوتا ہے، مگر اسے جنس کا قرار دے دیا جاتا ہے۔ یا کسی مقام پر عہد ذہنی کے لیے لایا گیا ہوتا ہے اور اسے عہد خارجی کا سمجھ کر ترجمہ کر دیا جاتا ہے یا معاملہ بعض اوقات اس سے اُلٹ بھی ہو جاتا ہے۔ ان تمام صورتوں میں اس بات کا اِمکان بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ قاری پر متکلم کی اصل منشا بالکل بھی واضح نہ ہو سکے:

اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا. (الاحزاب ۳۳: ۳۳)

''اللہ تو یہی چاہتا ہے، اِس گھر کی بیبیو کہ تم سے وہ گندگی دور کرے (جو یہ منافق تم پر تھوپنا چاہتے ہیں) اور تمھیں پوری طرح پاک کر دے۔''

اس آیت میں 'الرِّجس' کا لفظ آیا ہے۔ مترجمین نے عام طور پر اس کے الف لام کو جنس کا قرار دیا اور ''گندی باتیں''، ''ہر قسم کی گندگی'' اور ''ہر طرح کی ناپاکی'' وغیرہ کے الفاظ میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ ظاہر ہے، اس ترجمہ کے بعد بہت سی غیر متعلقہ بحثیں آپ سے آپ پیدا ہو گئیں اور بعد ازاں مستقل عقیدوں میں ڈھل گئی ہیں، دراں حالیکہ اس مقام پر ازواج مطہرات کو دیے جانے والے خصوصی احکام کے پیش نظر اصل میں اُنھیں منافقین کی ریشہ دوانیوں سے بچانا ہے جو اس قدر زیادہ ہو گئی ہیں کہ وہ اُن پر اب اخلاقی الزامات لگانے کی بھی راہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس لحاظ سے 'الرِّجس' کا الف لام عہد کے لیے ہے اور اُس گندگی کو بیان کر رہا ہے جو ان الزامات کے ذریعے سے یہ لوگ ازواج مطہرات پر تھوپ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ''البیان'' کے ترجمے میں بھی اسے جنس کے بجاے عہد کا قرار

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

دیا گیا ہے اور اس عہد کو کھولنے کے لیے ''وہ گندگی'' کے الفاظ اور پھر قوسین کے اندر اس کی وضاحت میں یہ جملہ بھی لکھ دیا گیا ہے: ''جو یہ منافق تم پر تھوپنا چاہتے ہیں''۔ دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ اس کے نتیجے میں کتاب اللہ کی یہ بات بہت واضح اور ہر طرح کے غل و غش سے پاک ہو کر ہمارے سامنے آ گئی ہے۔

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ. (التوبہ ۹: ۵)

''(بڑے حج کے دن) اِس (اعلان) کے بعد جب حرام مہینے گزر جائیں تو اِن مشرکوں کو جہاں پاؤ، قتل کرو۔''

یہاں اختلاف اس امر میں نہیں ہے کہ 'اَلْاَشْهُرُ الْحُرُمُ' کا الف لام عہد کے لیے ہے یا جنس کے لیے؟ بلکہ کم و بیش سب مترجمین کے نزدیک یہ عہد کے لیے ہے۔ البتہ، اختلاف اس امر میں ہے کہ اسے عہد خارجی کا سمجھا جائے یا عہد ذہنی کا۔ اکثر مترجمین اسے عہد خارجی کا قرار دیتے اور اس کا مطلب آیت ۲ کی روشنی میں یہ بیان کرتے ہیں کہ منکرین کو جن چار مہینوں کی مہلت دی گئی تھی، اصل میں یہ وہی چار مہینے ہیں۔ اس کے برخلاف، بعض حضرات کے ہاں یہ الف لام عہد ذہنی کے لیے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اشہر حرم کی تعبیر اسم اور علم کے طور پر استعمال ہوتی ہے اور اس سے ہٹانے کے لیے یہاں کوئی وجہ بھی موجود نہیں ہے، اس لیے عربیت کی رو سے اس پر آنے والا الف لام اب عہد ذہنی ہی کا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس سے مراد وہی چار مہینے ہیں جنھیں اصطلاح میں حرام مہینے کہا جاتا ہے، یعنی رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم۔ اب ظاہر سی بات ہے کہ براءت کا اعلان اگر حج کے موقع پر کیا جائے تو اس کے بعد حرام مہینوں میں سے تقریباً پچاس دن باقی رہ جاتے ہیں۔ ''البیان'' میں اسی رائے کو اختیار کیا گیا ہے اور حاشیہ میں اس کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے۔

وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ. (النور ۲۴: ۸)

''(اس کے بعد) عورت سے سزا اُسی صورت میں ٹل سکتی ہے کہ (اِس کے جواب میں) وہ بھی چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ یہ شخص جھوٹا ہے۔''

مذکورہ بالا آیت کے مقابلے میں یہاں معاملہ بالکل اُلٹ ہے۔ یہ لعان کے متعلق ایک ہدایت ہے اور اس میں 'اَلْعَذَاب' کا الف لام معہود ذہنی کے بجاے معہود خارجی کا ہے جس کا بیان آیت ۲ میں 'عَذَابَهُمَا' کے لفظ میں موجود ہے۔ ''البیان'' میں بھی اسے عہد خارجی کا قرار دیا گیا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ عربی زبان میں اگر معرفہ کا اعادہ معرفہ کی صورت میں کیا جائے اور کوئی قرینہ بھی مانع نہ ہو تو دوسرا بالکل پہلا ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس شادی شدہ

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

عورت کو دی جانے والی سزا بھی بعینہٖ وہی ہوگی جو اس سے پہلے 'عَذَابَهُمَا' کے الفاظ میں، یعنی سو کوڑوں کی صورت میں ہر زانی مرد و عورت کے لیے بیان کی جا چکی ہے۔[۱۴]

اسی طرح کی ایک مثال یہ آیت بھی ہے:

وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا. وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا. (الکہف ۱۸: ۵۲-۵۳)

''ہم اُن کے درمیان ایک ہلاکت کا گڑھا حائل کر دیں گے اور یہ مجرم اُس کی آگ کو دیکھیں گے اور سمجھ لیں گے کہ اُسی میں گرنے والے ہیں۔''

یہاں بھی دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ اکثر مترجمین 'النَّار' کے الف لام کو عہد ذہنی کا قرار دیتے ہوئے اس کا ترجمہ ''آگ''، ''دوزخ'' اور ''جہنم'' کے الفاظ میں کر رہے ہیں۔ ''البیان'' میں اسے عہد خارجی کا قرار دیتے ہوئے اس کا ترجمہ ''اُس کی آگ'' کے الفاظ میں کیا گیا ہے اور اس سے مراد پچھلی آیت میں مذکور ہلاکت کے گڑھے کی آگ ہے کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں یہ جملہ پچھلی بات سے گویا کٹ کر رہ جاتا ہے۔

بعض اوقات ایک ہی لفظ قرآن کے متعدد مقامات پر الف لام کی مختلف حیثیتوں میں استعمال ہو رہا ہوتا ہے اور اس وجہ سے اس کے سمجھنے میں کسی بڑی غلطی کے راہ پا جانے کا اِمکان بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے، جیسا کہ مثال کے طور پر 'الْاِنْسَان' اور 'الْمُشْرِكِيْن' کے الفاظ۔ ہم ان میں سے صرف 'الْمُشْرِكِيْن' کو ذیل میں بیان کرتے ہیں:

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. (النحل ۱۶: ۱۲۰)

''حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم (اپنی جگہ) ایک الگ امت تھا، اللہ کا فرماں بردار اور یک سو اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا۔''

اس آیت میں سیدنا ابراہیم کے اوصاف حمیدہ بتائے جا رہے ہیں، کچھ ایجابی انداز میں اور کچھ سلبی انداز میں۔ چنانچہ بادنیٰ تامل سمجھ لیا جا سکتا ہے کہ یہاں 'الْمُشْرِكِيْن' کا الف لام مشرکین کے زمرے، یعنی ان کی جنس کو بیان کرنے کے لیے آیا ہے۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ

''اہل کتاب ہوں یا مشرکین، ان میں سے جن

---

[۱۴] 'الْعَذَاب' سے پہلے اصل میں دو سزاؤں کا بیان ہوا ہے: ایک زنا کی اور دوسرے قذف کی۔ 'الْعَذَاب' سے مراد زنا کی سزا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ یہاں جس عورت سے سزا کے ٹل جانے کا بیان ہو رہا ہے، وہ اس سیاق میں کسی پر الزام نہیں لگا رہی کہ اس سزا کو قذف کی سزا قرار دیا جائے، بلکہ خود اُس پر الزام لگایا جا رہا ہے، اس لیے یہ قطعی طور پر زنا کی سزا ہی ہے۔

وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ. (البقرہ۲:۱۰۵)

لوگوں نے کفر کیا ہے، وہ نہیں چاہتے کہ تمھارے پروردگار کی طرف سے کوئی خیر تم پر نازل کی جائے۔''

اس آیت میں 'الْمُشْرِكِيْن' کا الف لام جنس کے بجاے عہد ذہنی کا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ متکلم اور مخاطب، دونوں کے ہاں یہ لوگ بالکل متعین ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا آیت میں بیان کردہ یہ وصف بھی کہ وہ ہرگز نہیں چاہتے کہ تم پر خدا کی طرف سے کوئی خیر اتاری جائے، اُنھیں واضح طور پر متعین کر رہا ہے۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ. (التوبہ۹:۶)

''اور اگر (اس دار و گیر کے موقع پر) اِن مشرکوں میں سے کوئی شخص تم سے امان چاہے (کہ وہ تمھاری دعوت سننا چاہتا ہے) تو اُس کو امان دے دے، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔''

یہاں الف لام عہد خارجی کے لیے ہے اور ''البیان'' کے ترجمہ میں اس کے لیے ''اِن مشرکوں'' کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ اس تعیین کی دلیل یہ ہے کہ آیت امیں بھی 'الْمُشْرِكِيْن' کا یہی لفظ آیا ہے اور زیر بحث آیت میں معرفہ کے اس اِعادہ نے یہ بات طے کر دی ہے کہ اس دوسرے سے مراد بھی اصل میں پہلا ہی ہے۔ یعنی اس سے مراد بھی وہی لوگ ہیں جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے من حیث الجملہ اِتمام حجت کیا جا چکا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۲۔ صلہ کا استعمال

بعض حروف لفظ کے اوپر صلہ ہو کر آتے ہیں اور معنی میں اچھا خاصا تنوع پیدا کر دیتے ہیں اور بعض اوقات متعدد معانی پر متضمن بھی ہو جاتے ہیں، چنانچہ ترجمہ کرتے ہوئے ان کی مکمل طور پر رعایت کرنا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ ''البیان'' میں یہ رعایت کس قدر برتی گئی ہے، اس کے لیے ہم اُن چند آیتوں کا ترجمہ پیش کرتے ہیں جن میں ایک ہی صلہ کو مختلف طریقوں سے استعمال کیا گیا ہے، جیسا کہ مثال کے طور پر 'اِلٰی' کا صلہ:

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ. (البقرہ۲:۱۲۵)

''اور ابراہیم و اسمٰعیل کو اِس بات کا پابند کیا کہ میرے اِس گھر کو اُن لوگوں کے لیے پاک رکھو جو (اِس میں) طواف کرنے، اعتکاف کرنے اور رکوع و سجود کرنے کے لیے آئیں۔''

'عَهِدَ' کے ساتھ جب 'اِلٰی' کا صلہ آئے تو اب اس کا مطلب صرف وعدہ کرنے کا نہیں، بلکہ اس سے آگے

بڑھ کر کسی پر ذمہ داری ڈال دینے کا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ''البیان'' میں اس کے لیے ''اس بات کا پابند کیا'' کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ. (الانعام ۶:۱۲)

''اُس نے اپنے اوپر رحمت لازم کر رکھی ہے۔ وہ تم سب کو جمع کر کے ضرور قیامت کی طرف لے جائے گا جس میں کوئی شبہ نہیں۔''

اس آیت میں 'اِلٰی' کا صلہ 'لَيَجْمَعَنَّكُمْ' کے بعد آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی لفظ ہانکنے اور لے جانے کے معنی میں محذوف ہے۔ چنانچہ دیگر مترجمین کے برعکس، جنھوں نے عام طور پر اس کا ترجمہ ''جمع کرے گا'' کیا ہے، ''البیان'' میں اس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے: ''وہ تم سب کو جمع کر کے ضرور قیامت کی طرف لے جائے گا۔''

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِى الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۴)

''بنی اسرائیل کو ہم نے اِسی کتاب میں اپنے اِس فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فساد برپا کرو گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔''

یہاں 'قَضَيْنَا' کے بعد 'اِلٰی' کا صلہ آیا ہے جس کا تقاضا ہے کہ اسے کسی ایسے فعل پر متضمن مانا جائے جو اس صلہ سے مناسبت رکھنے والا ہو اور وہ 'أبلغنا' یا اس کے ہم معنی کوئی فعل ہو سکتا ہے۔ مترجمین نے بالعموم ان دونوں افعال میں سے ایک کو سامنے رکھتے ہوئے ترجمہ کیا ہے، جیسا کہ ''فیصلہ کر دیا'' اور ''صاف کہہ سنایا''۔ ''البیان'' میں دونوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اس طرح ترجمہ کیا گیا ہے: ''اس فیصلے سے آگاہ کر دیا''۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ. اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ. (القیامہ ۷۵:۲۲-۲۳)

''کتنے چہرے اُس دن تر و تازہ ہوں گے، اپنے پروردگار کی رحمت کے منتظر۔''

اس آیت میں 'نظر' کے ساتھ 'اِلٰی' آیا ہے۔ اس کے دو ترجمے کیے جا سکتے ہیں: ایک کسی شے کی طرف دیکھنا اور دوسرے کسی سے اچھی بات کی کوئی امید رکھنا۔ سیاق دلیل ہے کہ یہ دوسرے معنی میں ہے، اس لیے کہ یہاں اگلی بات یہ بیان ہوئی ہے کہ دوزخ میں جانے والے اس اندیشہ میں مبتلا ہوں گے کہ اب وہ آفت ٹوٹنے والی ہے جو اُن کی کمر کو توڑ ڈالے گی۔ اب ظاہر ہے اس اندیشے کے مقابلے میں امید و رجا کا بیان ہی زیادہ موزوں ہو سکتا ہے۔ ''البیان'' میں اسی وجہ سے اس کا ترجمہ ''اپنے پروردگار کی رحمت کے منتظر'' کیا گیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

'اِلٰی' کی طرح حرف 'عَلٰی' بھی صلہ ہو کر آتا ہے اور الفاظ میں معنی کی کئی جہتیں پیدا کر دیتا ہے، جیسا کہ مثال کے طور پر یہ آیتیں:

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ وَطَھَّرَکِ وَاصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ. (آل عمران ۳:۴۲)

''اور جب فرشتوں نے مریم سے کہا: اے مریم، اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا ہے اور پاکیزگی عطا فرمائی ہے اور دنیا کی تمام عورتوں پر ترجیح دے کر (اپنی ایک عظیم نشانی کے ظہور کے لیے) منتخب کر لیا ہے۔''

'اصْطَفٰی' فعل کے ساتھ جب 'عَلٰی' کا صلہ آتا ہے تو یہ انتخاب سے آگے بڑھ کر اس میں ترجیح اور فضیلت کا مضمون بھی پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے: ''دنیا کی تمام عورتوں پر ترجیح دے کر منتخب کر لیا ہے۔''

وَنَحْشُرُھُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ عَلٰی وُجُوْھِھِمْ عُمْیًا وَّ بُکْمًا وَّ صُمًّا. (بنی اسرائیل ۱۷:۹۷)

''قیامت کے دن ہم اُن کو اُن کے منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے اکٹھا کریں گے، اندھے، گونگے اور بہرے۔''

یہاں 'نَحْشُرُھُمْ' کے ساتھ 'عَلٰی' استعمال ہوا ہے، اس لیے اس کے اندر اکٹھا کرنے کے ساتھ ساتھ گھسیٹنے کا مفہوم بھی شامل ہو گیا ہے۔ عام طور پر مترجمین اس کے ایک پہلو کو بیان کرتے ہیں: اکٹھا کرنے کو یا گھسیٹنے اور چلانے کو۔ ''البیان'' کے ترجمہ میں اس کے یہ دونوں پہلو بیان کر دیے گئے ہیں: ''منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے اکٹھا کریں گے۔''

قَالَ ھٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ مُسْتَقِیْمٌ. (الحجر ۱۵:۴۱)

''فرمایا: یہ (بندگی کا راستہ) ایک سیدھا راستہ ہے جو مجھ تک پہنچانے والا ہے۔''

اس آیت میں 'صِرَاط' کے بعد 'عَلٰی' آیا ہے۔ اب بات صرف یہ نہیں ہے کہ یہ راستہ سیدھا ہے اور خدا تک پہنچ جانے والا ہے، بلکہ اس میں یہ اضافی مضمون بھی پیدا ہو گیا ہے کہ یہ اپنے راہ رووں کو خود منزل پر پہنچا دینے والا ہے۔ ''البیان'' میں اس کے لیے ''مجھ تک پہنچانے والا ہے'' کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْہِ. (البقرہ ۲:۳۷)

''پھر آدم نے اپنے پروردگار سے (توبہ کے) چند الفاظ سیکھ لیے (اور اُن کے ذریعے سے توبہ کی) تو اُس پر اُس نے عنایت فرمائی اور اُس کو معاف کر دیا۔''

'تَابَ' کے بعد 'عَلٰی' کا صلہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہاں 'أقبل' یا اِس سے ملتا جلتا کوئی اور مفہوم بھی موجود ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم کو معاف کیا اور پوری توجہ سے اُس کی طرف ملتفت بھی ہو گیا۔ 'تَابَ' کے ساتھ یہی اضافی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مفہوم ہے جسے ''البیان'' میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: ''اُس نے عنایت فرمائی اور اُس کو معاف کر دیا۔''

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ. ''وہ غیب کی باتوں پر کبھی حریص نہیں رہا۔''

(التکویر ۸۱: ۲۴)

عربی زبان میں 'ضَنِین' کے معنی بخیل کے ہیں۔ اس آیت میں اس کا صلہ 'ب' نہیں، بلکہ 'عَلٰی' آیا ہے، چنانچہ اب اس میں حریص ہونے کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کاہنوں کی طرح غیب دانی کے حریص نہیں ہیں، بلکہ وہ خدا کی منشا اور اُس کے حکم سے نبوت اور وحی سے سرفراز ہوئے ہیں۔

'عَنْ' صلہ ہو کر آئے تو اس سے بھی کئی معانی ایسے پیدا ہوتے ہیں جن کو سمجھنے میں مترجمین کی طرف سے بعض اوقات سہو یا تساہل واقع ہو جاتا ہے:

اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ. (الانعام ۶: ۹۳)

''آج (تمھارے) اِس (جرم) کی پاداش میں تمھیں ذلت کا عذاب دیا جائے گا کہ تم اللہ پر ناحق تہمت باندھتے تھے اور اُس کی آیتوں سے متکبرانہ اِعراض کرتے تھے۔''

اس آیت میں 'تَسْتَكْبِرُوْنَ' کے ساتھ 'عَنْ' کا صلہ آیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لفظ یہاں اِعراض کے مفہوم پر بھی مشتمل ہے۔ عام طور پر مترجمین نے اس کا ترجمہ ''اس کی آیتوں سے تکبر کرتے تھے'' کیا ہے، اس کے برخلاف، ''البیان'' میں اِعراض کے اس مفہوم کو شامل کرتے ہوئے ترجمے میں ''متکبرانہ اعراض'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ. (الاعراف ۷: ۷۷)

''پھر انھوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور پورے تمرد کے ساتھ اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی کی۔''

مترجمین نے بالعموم یہاں صرف ''سرکشی'' کا ترجمہ کیا ہے، دراں حالیکہ 'عَتَوْا' کے ساتھ 'عَنْ' نے آ کر یہاں سرکشی کے ساتھ ساتھ منکرین کی نافرمانی کو بھی بیان کیا ہے۔ ''البیان'' میں ان دونوں مفاہیم کو اس طرح ادا کیا گیا ہے: ''پورے تمرد کے ساتھ اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی کی۔''

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ. (بنی اسرائیل ۱۷: ۷۳)

''(اے پیغمبر)، قریب تھا کہ یہ اُس چیز سے ہٹا کر تم کو فتنے میں ڈال دیں جو ہم نے تمھاری طرف وحی کی ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس آیت میں 'یَفۡتِنُوۡنَکَ' اپنے ساتھ 'عَنۡ' کے صلہ کی وجہ سے 'یصرفونك' پر مشتمل ہو گیا ہے، چنانچہ اس کا مطلب اب صرف فتنہ میں ڈال دینا نہیں ہے، بلکہ نازل ہونے والی وحی سے ہٹا کر فتنہ میں ڈال دینا ہے۔ 'عَنۡ' کے اسی متضمن معنی کا لحاظ ہے کہ ''البیان'' میں ''اُس چیز سے ہٹا کر فتنے میں ڈال دیں'' کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

حرف 'لام' بھی بہت سے الفاظ کے ساتھ بطور صلہ استعمال ہوتا ہے اور اپنے اندر معنی کے بہت سے پہلو رکھتا ہے:

قُلۡ لَّا تَمُنُّوۡا عَلَیَّ اِسۡلَامَکُمۡ بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیۡکُمۡ اَنۡ ھَدٰکُمۡ لِلۡاِیۡمَانِ. (الحجرات ۴۹: ۱۷)

''کہہ دو کہ اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو، بلکہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اُس نے تم کو ایمان کی توفیق عطا فرمائی۔''

مترجمین 'ھَدٰکُمۡ لِلۡاِیۡمَانِ' کا ترجمہ بالعموم 'ایمان کی ہدایت کی' کرتے ہیں، دراں حالیکہ 'ھدایت' کے بعد 'لام' کا صلہ ہو تو اس میں توفیق کا مضمون آ جاتا ہے۔ ''البیان'' میں اسی رعایت سے ''ایمان کی توفیق عطا فرمائی'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

وَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعۡیُنِنَا. (الطّور ۵۲: ۴۸)

''اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے پروردگار کے فیصلے کا انتظار کرو۔ (یہ تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے)، اس لیے کہ تم ہماری نگاہ میں ہو۔''

اس آیت میں 'صبر' کے ساتھ 'لام' کا صلہ آیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ انتظار کے مفہوم پر مشتمل ہے۔ چنانچہ اس کا صحیح ترجمہ وہی ہو سکتا ہے جس میں صبر کے ساتھ ساتھ انتظار کے پہلو کو بھی بیان کیا جائے اور ''البیان'' میں ایسا ہی کیا گیا ہے: ''ثابت قدمی کے ساتھ اپنے پروردگار کے فیصلے کا انتظار کرو۔''

بعض اوقات ایک ہی لفظ ہوتا ہے اور اس کا معنی و مفہوم صلہ کے بدل جانے سے بالکل بدل جاتا ہے۔ اس طرح کے الفاظ میں سے 'اٰمَنَ' کا لفظ ایک اچھی مثال ہے اور ذیل کی دو آیات میں اس کے دو مختلف مفاہیم آئے ہیں:

کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ. (البقرہ ۲: ۲۸۵)

''یہ سب اللہ پر ایمان لائے، اور اُس کے فرشتوں اور اُس کی کتابوں اور اُس کے پیغمبروں پر ایمان لائے۔''

وَاِذۡ قُلۡتُمۡ یٰمُوۡسٰی لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھۡرَۃً. (البقرہ ۲: ۵۵)

''اور یاد کرو جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ، ہم تمھاری بات کا ہرگز یقین نہ کریں گے، جب تک ہم خدا کو سامنے نہ دیکھ لیں۔''

'اٰمَنَ' کے ساتھ ''ب'' صلہ ہو کر آئے، جیسا کہ پہلی آیت میں آیا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے: کسی چیز پر ایمان

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

لانا۔ اگر ''لام'' صلہ ہو، جیسا کہ دوسری آیت میں ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے: کسی کی بات مان لینا۔ بعض اوقات مترجمین 'لام' صلہ کے ساتھ آنے والے 'اٰمَنَ' کا ترجمہ بھی ایمان لانا ہی کر دیتے ہیں۔ ''البیان'' میں کیے گئے ان آیتوں کے ترجمے میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اس فرق کو ملحوظ رکھنے کی ایک اچھی کوشش کی گئی ہے۔

۳۔ اِعراب کا اثر

عربی زبان میں الفاظ پر مختلف اعراب آتے ہیں۔ ان کا دِقّت نظر سے مطالعہ معنی کی تعیین کرنے اور کلام کے بہت سے مضمرات کو سمجھنے میں بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے ہم ''البیان'' میں سے چند آیات کا ترجمہ پیش کرتے ہیں:

اِذۡ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّکَ مَا یُوۡحٰۤی. اَنِ اقۡذِفِیۡهِ فِی التَّابُوۡتِ فَاقۡذِفِیۡهِ فِی الۡیَمِّ فَلۡیُلۡقِهِ الۡیَمُّ بِالسَّاحِلِ. (طٰہٰ ۲۰: ۳۸-۳۹)

''جب ہم نے تمھاری ماں کو وہ بات الہام کی تھی جو (اِس وقت تمھیں) وحی کی جا رہی ہے کہ اس بچے کو صندوق میں رکھو، پھر صندوق کو دریا میں ڈال دو۔ پھر دریا اُس کو کنارے پر ڈال دے۔''

یہاں 'فَلۡیُلۡقِهِ' کا اِعراب قابل توجہ ہے۔ کئی مترجمین نے اس لفظ کو جوابِ امر خیال کرتے ہوئے ترجمہ کیا ہے، حالاں کہ اس پر لام آیا ہے اور اس وجہ سے یہ یقینی طور پر امر غائب ہے۔ ''البیان'' میں اس کے امر غائب ہونے کا لحاظ ہے کہ اس کا ترجمہ ''پس دریا اُسے کنارے لا ڈالے گا'' کے بجاے اس طرح کیا گیا ہے: پھر دریا اُس کو کنارے پر ڈال دے۔''

وَدُّوۡا لَوۡ تُدۡهِنُ فَیُدۡهِنُوۡنَ. (القلم ۶۸: ۹)

''یہ تو چاہتے ہیں کہ تم ذرا نرم پڑو، پھر یہ بھی نرم پڑ جائیں گے۔''

بعض مترجمین نے اس آیت کے مفہوم کو اس طرح کے الفاظ میں ادا کیا ہے: ''وہ تو چاہتے ہیں کہ تو ذرا ڈھیلا ہو تو یہ بھی ڈھیلے پڑ جائیں۔'' حالاں کہ اس آیت میں 'فَیُدۡهِنُوۡنَ' کا لفظ 'لَوۡ تُدۡهِنُ' کا جواب نہیں ہے کہ اس صورت میں یہاں 'فیدھنوا' لایا جاتا۔ یہ اصل میں 'لَوۡ تُدۡهِنُ' پر عطف ہے اور اس کا مبتدا 'ھم' یہاں محذوف کر دیا گیا ہے۔ 'فَیُدۡهِنُوۡنَ' کے اسی اعراب کا لحاظ ہے کہ ''البیان'' میں ''نرم پڑ جائیں'' کے بجاے ''نرم پڑ جائیں گے'' کے الفاظ میں ترجمہ ہوا ہے۔

وَالۡمُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِهِمۡ اِذَا عٰهَدُوۡا وَالصّٰبِرِیۡنَ

''اور وفاداری تو اُن کی وفاداری ہے کہ جب عہد کر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ. (البقرہ ۲:۱۷۷)

بیٹھیں تو اپنے اِس عہد کو پورا کرنے والے ہوں اور خاص کر اُن کی جو تنگی اور بیماری میں اور جنگ کے موقع پر ثابت قدم رہنے والے ہوں۔''

یہاں 'الصّٰبِرِیْنَ' کی صفت 'الْمُوْفُوْنَ' پر عطف ہونے کی وجہ سے حالت رفعی میں ہونی چاہیے تھی، مگر اسے حالت نصب میں لایا گیا ہے۔ اعراب کی یہ تبدیلی اصل میں علی سبیل الاختصاص، یعنی صفت پر خصوصی توجہ مبذول کروانے کے لیے ہوئی ہے۔ گویا متکلم کہنا چاہتا ہے کہ 'أنا أخص بالذکر الصابرین'، یعنی میں صابرین کا ذکر یہاں خاص طور پر کرنا چاہتا ہوں۔ اس اعراب سے پیدا ہونے والا یہ معنی ہے کہ ''البیان'' میں ترجمہ کرتے ہوئے اس کے لیے ''خاص کر'' کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

وَیَعْلَمَ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا مَالَھُمْ مِّنْ مَّحِیْصٍ. (الشوریٰ ۴۲:۳۵)

''اِس لیے تباہ کر دے کہ اُن سے انتقام لے اور اس لیے کہ جو لوگ ہماری آیتوں میں کٹ حجتی کر رہے ہیں، وہ جان لیں کہ اُن کے لیے کوئی مفر نہیں ہے۔''

اس آیت میں 'یَعْلَمَ' حالت نصب میں ہے، مگر کئی مترجمین نے اسے بالکل نظر انداز کر کے ترجمہ کیا ہے۔ سیاق میں دیکھا جائے تو یہ نصب لام تعلیل کی وجہ سے ہے، جو 'یَعْلَمَ' کے معطوف علیہ سمیت حذف ہو گیا ہے۔ ''البیان'' میں اسے ادا کرنے کے لیے پہلے ایک مناسب حال معطوف علیہ، یعنی: ''اس لیے تباہ کر دے کہ اُن سے انتقام لے۔'' نکالا گیا ہے اور اس کے بعد 'ولیعلم' کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

دیگر الفاظ

مرادی معنی معلوم کرنے میں لفظ کی ساخت اور اُس پر آنے والے عوارض کے بعد تیسری اہم تر چیز یہ ہے کہ کلام میں آئے ہوئے دیگر الفاظ پر بھی اچھی طرح سے غور و خوض کر لیا جائے۔ دوسری صورت میں اس بات کا قوی امکان ہوتا ہے کہ ایک مجوزہ معنی کی تائید میں ہم چاہے لغت کے شواہد اور قرآن میں سے اُس کے بہت سے نظائر پیش کر دیں، مگر وہ حقیقت میں کسی مقام پر حشو قرار پاتا ہو یا بالکل ہی غلط بیٹھتا ہو۔ اس بات کو ہم چند عنوانات کے تحت واضح کرتے ہیں:

ا۔ ساتھ میں آ جانے والے لفظ کا معنی پر اثر

بسا اوقات کسی لفظ کے معنی کی تعیین اُن دوسرے الفاظ پر منحصر ہوتی ہے جو کلام میں اس کے ساتھ ہی استعمال ہو رہے ہوتے ہیں۔ اس کی مثال کے لیے ذیل کی چند آیتیں دیکھ لی جا سکتی ہیں:

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ. (البقرہ۲:۲۸۲)

''ایمان والو، تم کسی مقرر مدت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اُسے لکھ لو۔''

یہاں 'تَدَایَنْتُمْ' کا لفظ آیا ہے، جس کا مطلب ہے ادھار لین دین کرنا۔ اس کے بعد چونکہ 'بِدَیْنٍ' بھی آ گیا ہے جس نے ادھار معاملے کی وضاحت کر دی ہے، اس لیے 'تَدَایَنْتُمْ' اب مجرد ہو کر صرف لین دین تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ ''البیان'' میں اسی لیے 'بِدَیْنٍ' کے لیے ''ادھار'' اور 'تَدَایَنْتُمْ' کے لیے محض ''لین دین کرو'' کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى. (الحشر۵۹:۲۴)

''وہی اللہ ہے نقشہ بنانے والا، وجود میں لانے والا اور صورت دینے والا۔ سب اچھے نام اُسی کے ہیں۔''

عربی زبان میں بعض الفاظ اپنے اصل معنی سے ہٹ کر توسعاً دوسرے معنوں میں استعمال ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثال لفظ 'خلق' بھی ہے جو اپنے وسیع تر اطلاق میں تخلیق کرنے اور بنانے کے معنی میں آتا ہے، وگرنہ اس کا اصل معنی اندازہ کرنا اور خاکہ بنانا ہے۔ زیر نظر آیت میں یہ اپنے اصل معنی میں آیا ہے۔ اس کی وجہ اس کے ساتھ آنے والا لفظ 'الْبَارِئُ' ہے، جس کا اپنا ایک معنی بھی چونکہ کسی شے کو وجود میں لانا ہے، اس لیے اب 'الْخَالِق' اپنے اصل معنی کی طرف لوٹ گیا ہے۔ ''البیان'' میں یہی وجہ ہے کہ اس کا ترجمہ ''نقشہ بنانے والا'' کیا گیا ہے۔ اس ترجمہ کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ اس ترتیب میں، یعنی نقشہ بنانے اور کسی شے کو وجود میں لانے کے بعد 'الْمُصَوِّر' کے استعمال میں، 'الْمُصَوِّر' کا صحیح مفہوم بھی ہمارے سامنے آ گیا ہے کہ وہ کسی شے کی تصویر بنانا نہیں، بلکہ اُسے صورت دینا، یعنی نوک پلک درست کر کے اُسے آخری شکل دے دینا ہے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ. (آل عمران۳:۸۵)

''اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرنا چاہے گا تو اُس سے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔''

لفظ 'دین' کے ایک سے زائد مستقل مفاہیم ہیں۔ اس آیت میں اس کے ساتھ آنے والا 'الْاِسْلَام' چونکہ ایک مذہب کے نام کے طور پر آیا ہے، اس لیے یہ طے ہے کہ اس کے غیر کے لیے آنے والا 'دِیْنًا' کا لفظ بھی اپنے بہت سے مفاہیم میں سے ایک مفہوم، یعنی ''مذہب'' ہی کے لیے آیا ہے۔

مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ. (یوسف۱۲:۷۶)

''بادشاہ کے قانون کی رو سے وہ اپنے بھائی کو روکنے کا مجاز نہ تھا، الّا یہ کہ خدا ہی چاہے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس آیت میں 'دین' کے لفظ کے ساتھ 'الْمَلِك' کی اضافت کا خیال رکھا جائے تو یہاں اس کا مطلب ''قانون'' ہی موزوں قرار پاتا ہے، جیسا کہ ''البیان'' میں اس کا یہ ترجمہ کیا بھی گیا ہے۔

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا. فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا. فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا. فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا. اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ. وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ. وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ. (الذاریات ۵۱: ۱-۷)

''تند ہوائیں گواہی دیتی ہیں جو غبار اڑاتی ہیں، پھر (پانی سے لدے ہوئے بادلوں کا) بوجھ اٹھاتی ہیں، پھر نرمی کے ساتھ چلتی ہیں، پھر الگ الگ معاملہ کرتی ہیں۔ (یہ گواہی دیتی ہیں) اور دھاریوں والا آسمان بھی کہ جس عذاب کی وعید تمھیں سنائی جا رہی ہے، وہ یقیناً سچ ہے اور جزا و سزا واقع ہو کر رہے گی۔''

اس آیت میں قسم اور جواب قسم کی باہمی موافقت ہی طے کر دیتی ہے کہ 'الدِّيْن' کا لفظ جزا کے لیے آیا ہے، مگر 'وَاقِع' کا لفظ بھی بڑی حد تک اس تعیین میں معاونت کر رہا ہے کہ اس کا استعمال لفظ 'دین' کے دیگر مفاہیم، یعنی مذہب اور قانون سے کچھ مناسبت نہیں رکھتا اور یہی وجہ ہے کہ ''البیان'' میں اس کا ترجمہ ''جزا و سزا'' کیا گیا ہے۔

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ. اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ. (الزمر ۳۹: ۲-۳)

''سو اللہ ہی کی بندگی کرو، اپنی اطاعت کو اُسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔ سنو، خالص اطاعت اللہ ہی کے لیے ہے۔''

فرمایا ہے کہ اللہ ہی کی بندگی کرو۔ اس کے بعد 'الدِّيْن' کے لفظ کو لانا یہ بالکل واضح کر دیتا ہے کہ یہاں اس سے اُسی بندگی کی عملی صورت، یعنی اطاعت مراد لی گئی ہے۔ چنانچہ ''البیان'' میں اس طرح کے مواقع پر اس کا ترجمہ ''اطاعت'' ہی کیا جاتا ہے۔

بعض اوقات دو الفاظ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح آتے ہیں کہ دونوں ہی اپنے اپنے معنی کو واضح کر دیتے ہیں:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. (البقرہ ۲: ۱۲۹)

''پروردگار، اور اُنھی میں سے تو اُن کے اندر ایک رسول اٹھا جو تیری آیتیں انھیں سنائے اور قانون اور حکمت سکھائے اور اس طرح انھیں پاکیزہ بنائے۔''

'الْكِتٰب' قرآن میں ایک سے زائد معانی کے لیے آتا ہے: خط، کتاب اور قانون کے لیے۔ اسی طرح 'الْحِكْمَة'

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بھی سمجھ بوجھ، دلائل و براہین اور دین کی حقیقت اور ایمان و اخلاق کے مباحث کے لیے آتا ہے۔ لیکن ان دونوں الفاظ کے بارے میں یہ طے ہے کہ جب یہ ایک دوسرے پر عطف ہو کر آئیں گے تو اب 'الْکِتٰب' سے مراد قانون اور 'الْحِکْمَة' سے مراد دین کی حقیقت اور ایمان و اخلاق کے مباحث ہی ہوں گے۔ اس طرح کے تمام مواقع پر ''البیان'' کے تفسیری حواشی میں ان معانی کی بخوبی وضاحت کر دی گئی ہے۔

۲۔ تقابل میں آنے والے لفظ کا معنی پر اثر

قرآن میں بہت سے مقامات پر کسی لفظ کے معنی کی تعیین اس کے مقابل میں آنے والے الفاظ سے بھی ہوتی ہے۔ اس کی مثال کے لیے ذیل کی چند آیتیں دیکھ لی جا سکتی ہیں:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ. (النحل ۱۶: ۳۶)

''ہم نے ہر قوم میں ایک رسول اِس دعوت کے ساتھ بھیجا تھا کہ اللہ کی بندگی کرو اور شیطان سے بچو۔''

'طاغوت' ایک وصف ہے جو متکبر، سرکش اور اپنی حدود سے تجاوز کرنے والے شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ زیر نظر آیت میں اس کا اطلاق شیطان پر کیا گیا ہے، اس لیے کہ یہاں پیغمبروں کی دعوت کے دو بنیادی اجزا کا بیان ہو رہا ہے: اللہ کی عبادت اور طاغوت سے اجتناب۔ سو اس تقابل، یعنی اجتناب کے مقابلے میں عبادت اور 'الطَّاغُوْت' کے مقابلے میں لفظ 'اللّٰه' کا لحاظ رہے تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں اس سے مراد لامحالہ شیطان ہی ہے۔

فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ وَاشْکُرُوْا لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنِ. (البقرہ ۲: ۱۵۲)

''لہٰذا تم مجھے یاد رکھو، میں تمھیں یاد رکھوں گا اور میرے شکر گزار بن کر رہو، میری ناشکری نہ کرو۔''

'کفر' کا لفظ انکار اور ناشکری، دونوں مفاہیم کے لیے آتا ہے۔ اس کے مقابل میں ایمان کا ذکر ہو تو اس کا مطلب ماننے سے انکار کر دینا، یعنی کفر کرنا ہوتا ہے اور مقابل میں شکر گزاری ہو تو طے ہو جاتا ہے کہ اب اس کا مطلب ناشکری کرنا ہے۔ سو یہی وجہ ہے کہ ''البیان'' میں اس لفظ کا ترجمہ یہاں ''ناشکری'' کیا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ. (النحل ۱۶: ۹۰)

''اللہ (اِس میں) عدل اور احسان اور قرابت مندوں کو دیتے رہنے کی ہدایت کرتا ہے اور بے حیائی، برائی اور سرکشی سے روکتا ہے۔''

'مُنْکَر' سے مراد اصل میں وہ برائیاں ہوتی ہیں جنھیں انسان بالعموم برا جانتے ہیں۔ یہاں اُن میں سے خاص وہ برائیاں مراد ہیں جو کسی کا حق تلف کرنے والی ہوتی ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ 'عَدْل' کے مقابل میں آیا ہے،

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جس کا مطلب حق دار کو اس کا حق ادا کرنا ہے۔ ''البیان'' کے حواشی میں اس لفظ کی مراد کے متعلق یہ وضاحت اچھی طرح سے کر دی گئی ہے۔

۳۔ ساتھ میں آنے والی ضمائر کا معنی پر اثر

ضمیریں بھی اپنی حقیقت میں لفظ ہوتی ہیں جو اپنے مراجع کی طرف رجوع کرتی ہیں اور اس اعتبار سے یہ اُن کے ساتھ آئے ہوئے دوسرے الفاظ ہی ہوتی ہیں۔ سو معنی کی تعیین میں اُن کا اور اُن کے مراجع کا صحیح طور پر ادراک ہونا بہت زیادہ ضروری ہوتا ہے:

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ. (یوسف ۱۲: ۷۶)

''اِس پر اُس شخص نے یوسف کے بھائی کی خرجی سے پہلے اُن کی خرجیوں کی تلاشی لینا شروع کی، پھر (بادشاہ کا پیمانہ تو نہیں ملا، لیکن) اُس کے بھائی کی خرجی سے اُس نے وہ پیالہ برآمد کر لیا (جو یوسف نے رکھا تھا)۔''

سیدنا یوسف علیہ السلام کے اس واقعہ میں 'اَسْتَخْرَجَهَا' کا لفظ آیا ہے۔ عام طور پر اس کی ضمیر 'ھا' کا مرجع لوگوں نے بادشاہ کے پیمانے کو قرار دیا ہے، دراں حالیکہ یہ ضمیر مونث ہے اور بادشاہ کے پیمانے کے لیے لفظ 'صُوَاع' استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ یہ طے ہے کہ بنیامین کے سامان سے نکلنے والا پیالہ بادشاہ کے 'صُوَاع' کے بجاے یوسف کا 'السِّقَايَة' تھا۔ ''البیان'' میں ضمیر کے اس صحیح مرجع کے لحاظ سے ترجمہ کیا گیا ہے اور دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ اس کے نتیجے میں واقعے کی اصل صورت بھی سامنے آ جاتی ہے اور وہ طول طویل بحثیں بھی خود سے ختم ہو جاتی ہیں جو لوگوں نے حضرت یوسف کے اخلاق حسنہ پر، افسوس یہ کہ اُٹھا دی ہیں۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ. (البقرہ ۲: ۴۵)

''اور (اس راہ پر چلنے کے لیے) صبر اور نماز سے مدد چاہو، اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ سب بہت بھاری ہے، مگر ان کے لیے بھاری نہیں ہے جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔''

اس آیت میں 'وَاِنَّهَا' کی ضمیر کے بارے میں بحث ہے کہ یہ کس طرف راجع ہے؟ مترجمین اس کے مونث ہونے کا لحاظ کرتے ہوئے اسے بالعموم 'الصَّلٰوة'، یعنی نماز کی طرف لوٹاتے ہیں، دراں حالیکہ یہاں اصل مسئلہ ضمیر اور اس

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کے مرجع میں تذکیر و تانیث کی موافقت کا ہے ہی نہیں۔ عربی زبان میں اس طرح کے مواقع پر جب مونث ضمیر لائی جاتی ہے تو وہ کسی ایک چیز کے بجاے کلام میں مذکور سب چیزوں کی طرف لوٹ رہی ہوتی ہے۔ یہاں بھی مرجع صرف نماز نہیں، بلکہ وہ سب باتیں ہیں جو اس سلسلۂ بیان میں بنی اسرائیل سے کہی گئی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ''البیان'' میں اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے: ''یہ سب بہت بھاری ہے۔''

قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ. (المائدہ ۵: ۱۰۲) ''تم سے پہلے ایک قوم نے اسی طرح کی باتیں پوچھیں، پھر اُنھی کے منکر ہو کر رہ گئے تھے۔''

فرمایا ہے کہ ایمان والو، تم ایسی باتیں نہ پوچھا کرو جو اگر ظاہر کر دی جائیں تو تم پر گراں ہوں۔ اس کے بعد فرمایا ہے: 'قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ'۔ یہاں 'ھا' کی ضمیر کا مرجع تو طے ہے کہ وہ 'اَشْيَآءَ' کا لفظ ہی ہے، مگر یاد رہے کہ اس سے مراد خاص وہ 'أشیاء' نہیں، بلکہ اُن کی نوعیت ہے۔ یعنی، مطلب یہ نہیں ہے کہ تم سے پہلے لوگوں نے بھی ٹھیک یہی 'أشیاء'، یعنی باتیں پوچھی تھیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اسی قسم کی باتیں تھیں جو اُنھوں نے بھی پوچھی تھیں۔ ''البیان'' میں بیان نوعیت کی اس ضمیر کا لحاظ ہے کہ ترجمے میں ''اسی طرح کی باتیں'' کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا. (البقرہ ۲: ۷۳) ''چنانچہ ہم نے کہا: اِس (مردے) کو اُسی (گاے) کا ایک ٹکڑا مارو (جو قسمیں کھانے کے لیے ذبح کی گئی ہے تو وہ زندہ ہو گیا)۔''

اس مقام پر بنی اسرائیل کی تاریخ کے دو واقعات بیان ہوئے ہیں: ایک میں اُنھیں قسامہ کی غرض سے گاے قربان کرنے کا حکم دیا گیا ہے جس پر انھوں نے کافی لیت و لعل کرنے کے بعد عمل کیا۔ دوسرے واقعہ میں بھی قتل کے ایک مقدمے اور قسامہ کا بیان ہے جس میں انھوں نے جھوٹی قسمیں کھائیں اور ایک دوسرے پر الزام دھرنے لگے۔ اس کے بعد فرمایا ہے: 'فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا'۔ یہاں 'ھا' کی ضمیر کا مرجع بظاہر ایسا لگتا ہے کہ پہلے واقعہ میں ذبح ہونے والی گاے ہی ہے، مگر تدبر کی نگاہ سے دیکھیں تو یہ اصل میں وہ گاے ہے جو دوسرے واقعہ میں ذبح کی گئی ہے، لیکن اس ساری بات کو لفظوں میں بیان کرنے کے بجاے اس کے لیے محض ایک ضمیر لائی گئی ہے۔ ''البیان'' میں یہی وجہ ہے کہ ترجمہ کرتے ہوئے اس ضمیر میں مضمر ساری بات کو قوسین کے اندر کھول دیا گیا ہے۔

اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ. فَقَالَ اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ ''یاد کرو، جب خاصے کے اصیل اور عمدہ گھوڑے شام کے وقت اُس کے ملاحظے کے لیے پیش کیے گئے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

رَبِّیۡ حَتّٰی تَوَارَتۡ بِالۡحِجَابِ. (ص ۳۸: ۳۱-۳۲)

(اور اُن کے دیکھنے میں وہ ایسا محو ہوا کہ نماز جاتی رہی) تو اُس نے کہا: یہ تو اپنے پروردگار کی یاد سے غافل ہو کر، میں مال کی محبت میں لگ گیا، یہاں تک کہ آفتاب (مغرب کے) پردے میں چھپ گیا ہے۔''

اوپر جتنی مثالیں گزریں ان میں ضمیر کے مراجع کسی نہ کسی صورت میں کلام کے اندر موجود ہیں۔ بعض اوقات یہ مذکور نہیں ہوتے، مگر وہاں موجود ضرور ہوتے اور صرف قرینہ سے سمجھ لیے جاتے ہیں۔ سیدنا سلیمان کے اس واقعہ میں بھی دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ 'تَوَارَتۡ' کی ضمیر کا فاعل لفظوں میں بیان نہیں ہوا، بلکہ اسے کلام میں بیان کردہ ''شام کے وقت'' سے سمجھا گیا ہے کہ وہ اصل میں آفتاب ہے۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com